تفسیر
سورۃ والعصر

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

مَكِّيَّةٌ ____________ آیات : ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○

زمانہ گواہی دیتا ہے کہ آدمی گھاٹے میں ہے مگر جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

---

۱ ۔ سورہ کی دو تاویلیں

جن لوگوں نے فصحائے عرب کے کلام کا وقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی کلام دو معنوں کا احتمال رکھتا ہو، عام اور خاص، اور حالت ایسی ہو کہ معنیٰ خاص کلام کے موقع اور سیاق کی پوری موافقت کے ساتھ کسی خاص قوم یا کسی خاص حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہو اور معنیٰ عام بھی اپنی جگہ پر نہایت محکم اور بلند ہو تو ایسے موقع پر کلام کی دو تاویلیں کرتے ہیں تاکہ کلام موقع و محل کی مخصوص رعایات کے ساتھ ساتھ اپنی عمومیت اور وسعت کے فوائد کو بھی باقی رکھ سکے اور ان امور کی طرف بھی اشارہ کر سکے جن کے لیے اشارہ ہی بہتر ہے، تصریح بہتر نہیں ہے۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جو تمام مفسرین اور ارباب تاویل کے یہاں مسلم ہے اور ہم نے اپنی کتاب اصول التاویل[۱] میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بات جاننی چاہیے کہ سورہ والعصر جوامع الکلم میں سے ہے اور اس کی دو تاویلیں ہیں۔ ایک خاص اور محدود تاویل، دوسری عام اور وسیع تاویل۔ پہلے ہم خاص تاویل کے لحاظ سے اس کی تفسیر کریں گے۔ جس سے پچھلی سورہ کے ساتھ اس کا تعلق بھی روشنی میں آئے گا۔ اس کے بعد اس کی عام اور وسیع تاویل بیان کریں گے اور یہ پہلو بھی ماسبق سورہ سے بے تعلق نہ ہوگا۔

۲ ۔ سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے اس کا تعلق

پہلی سورہ (سورۂ تکاثر) میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت و جاہ، طلب مال اور عیش دنیا کی خود فراموشیوں

---

[۱] مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تصنیف عربی میں ہے اور ابھی شائع نہیں ہو سکی (مترجم)

میں گم ہیں۔ ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کا محور بس دنیا ہے جس کے عشق میں انھوں نے اپنی عمریں گنوا دیں حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی بدبختی اور نامرادی نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت ایک مقام فرمایا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ
أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ
يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ
أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ
بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَ
رُسُلِي هُزُوًا ۝ (الکہف: ۱۰۳-۱۰۶)

کہو! میں تمھیں خبر دوں ان لوگوں کی جو بالکل گھاٹے میں رہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جن کی تمام سرگرمی دنیا کی زندگی میں برباد ہوئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑا مفید کام کر رہے ہیں (یعنی جمع مال کے لیے اپنی مجنونانہ کوششوں کو دانائی سمجھتے رہے اور جو لوگ آخرت کے کاموں میں مشغول تھے ان کو بے وقوف خیال کیا)۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں (آیات بعث وجزا) اور آخرت میں اس کے سامنے حضوری کا انکار کیا، پس ان کے تمام اعمال برباد ہو گئے (یہی خسران عظیم ہے) اور قیامت کے دن ان کی کوئی پوچھ نہ ہوگی۔ یہ ان کا بدلہ جہنم ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیوں اور میرے رسولوں کو مذاق سمجھا۔

یہ ان ارباب نعمت کا بیان ہے جو دولت کے نشہ میں نبیوں اور رسولوں کا مذاق اڑاتے رہے اور اللہ کی نشانیوں اور روز آخرت کے منکر تھے۔

اب سورۂ والعصر پر غور کرو، ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا ہے جو عشق دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں پھر اصلی کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کر کے، یہ دولت جاوداں حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس لوگوں کو چاہیے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہو کر، حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے، اس چیز کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے۔ ورنہ ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی اس بے حاصلی و بوالہوسی پر ماتم کریں گے لیکن اس وقت کا ماتم بالکل بے سود ہوگا۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ
قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ
صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ
إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ
وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ
يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ فَإِذَا نُفِخَ
فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ
بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ۝
فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آ کھڑی ہوگی وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار مجھے لوٹا دے (دنیا میں) تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں (مال و دولت) اس میں جا کر نیک کام کروں۔ ہرگز نہیں! (یعنی وہ ہرگز دنیا میں لوٹائے نہ جائیں گے) یہ اس کی زبانی باتیں ہیں (یعنی نہ تو اب ان کی تمنا پوری ہوگی اور نہ یہ اپنے وعدے میں سچے ہیں) اور ان کے پیچھے ایک پردہ ہوگا (یعنی ایک آڑ جوان کے اور ان کے دنیاوی مال و متاع کے بیچ میں حائل ہو جائے گی) قیامت کے دن تک۔ پس جب صور پھونکا جائے گا تو نہ اس دن آپس کے رشتے قائم رہ سکیں گے اور نہ ایک دوسرے سے مدد مانگ سکیں گے (یعنی حشر کے بعد بھی وہ اپنے دنیاوی مال و متاع اور اعوان و انصار کی حمایت

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝
وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ
خَالِدُونَ ۝
(المومنون: ۹۹-۱۰۳)

سے محروم ہوں گے۔ صرف ان کے اعمال کی مسئولیت ان کے ساتھ ہوگی) پس جن کے پلے بھاری ہوں گے (یعنی جنھوں نے خیر باقی کی کمائی کی ہوگی) وہ لوگ کامیاب ہونے والوں میں ہوں گے۔ اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے (اس لیے کہ انھوں نے نیک کام نہیں کیے اور ساری زندگی زخارف دنیا کے عشق و طلب میں گنوا دی) وہ لوگ گھاٹے میں ہوں گے (یہ اصلی نامرادی اور بدبختی ہے) ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ان آیات سے جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں معلوم ہوا کہ انسان کا خسران اس امر پر مبنی ہے کہ روز جزا مشدنی ہے اور انسان چونکہ اپنے رب کے قبضۂ تصرف میں ہے اس وجہ سے ایک روز اس سے اس کی زندگی کے تمام اعمال و افعال اور خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں کے متعلق پرستش ہوگی۔

اسی اصول پر اس سورہ (والعصر) میں ضروری ہوا کہ پہلے جزا کو ثابت کیا جائے۔ چنانچہ سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے وہ جزا و سزا کے لازم ہونے کو ثابت کرتی ہے پھر اس عظیم نقصان کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی اس عظیم الشان نعمت یعنی اس زندگی کے قیمتی ایام ضائع کر دینے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوگا۔ پھر آگے بڑھ کر کامیابی اور نجات کی راہ کھول رہی ہے اور یہ ساری باتیں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ صرف چند لفظوں میں بیان ہو گئی ہیں۔

۳- لفظ عصر کی تحقیق

عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ جس طرح لفظ 'دہر' میں زمانہ کی مجموعیت کا لحاظ ہے۔ اسی طرح لفظ 'عصر' میں اس کے گزرنے اور اس کی تیز روی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق بیشتر گزرے ہوئے زمانہ پر ہوتا ہے۔ امرؤ القیس کا شعر ہے:

وَهَل ینعمن من کان فی العصر الخالی

اور ان کے لیے کیا مبارک باد ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں تھے

عبید بن الابرص نے کہا ہے:

فذاک عصر وقد اراني ... یحملني بازل شبوب

وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے آپ کو دیکھتا تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں "قد ارانی" یعنی حین کنت ارانی جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ متلمس کا شعر ہے۔

عرفت لاصحاب الغائب جدة ... اذا عرفوا لی فی العصور الاوائل

طرماح بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جاہلی نہیں تھا۔

الی اهتدیت لتسلیم علی دمن ... بالغمر غیرهن الاعصر الاول

میں نے مقام غمر میں ایسے کھنڈروں پر سلام کیا جن کو گردش روزگار نے بالکل متغیر کر دیا تھا

اسی مفہوم میں درید بن صمۃ نے بھی ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے:

فان لا تترکی عذلی سفاها تلمك علیه نفسك غیر عصر

(اگر تو مجھے بے وقوفی سے ملامت کرنا نہ چھوڑے گی تو زیادہ زمانہ نہ گزرے گا کہ اس بات پر تیرا نفس تجھ کو خود ملامت کرے گا)

"غیر عصر" یعنی "من غیر ان یمر بك کثیر زمان"

اسی تیز روی اور گزرنے کے مفہوم کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے لیے اعصار کا لفظ استعمال ہوا۔ دن کے آخری حصہ کو جب دن گزر کر گویا نچڑ جاتا ہے عصر کہتے ہیں۔ عنصر الشئ میں بھی اسی معنی کا لحاظ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر ایک طرف زمانۂ گزشتہ کے حوادث و احوال یاد دلا رہا ہے، دوسری طرف زمانہ کی ایک مخصوص صفت یعنی اس کی تیز روی اور برق رفتاری کی طرف توجہ دلا رہا ہے اور ان دونوں حقیقتوں کی وضاحت سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اللہ کے فیصلے نافذ ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے، جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کلام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایک حد تک ان حقائق سے آشنا تھے۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ حکمت آشنا تھے انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں ان نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثقب عبدی کا شعر ہے۔

ان الامور اذا استقبلتها اشتبهت وفی تدبرها التبیان والعبر

(معاملات جب اول اول سامنے آتے ہیں مشتبہ حالت میں ہوتے ہیں لیکن جب ان پر تدبر کرو تو ان میں بڑی بڑی بصیرتیں نہاں ہوتی ہیں)

قس بن ساعدہ نے کہا ہے:

فی الذاهبین الاولین من القرون لنا بصائر

(گزر جانے والی نسلوں میں ہمارے لیے بڑی بڑی عبرتیں ہیں)

اس شعر میں "بصائر" کے لفظ سے عام عبرتوں کے علاوہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی شاعر نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

یا ارباب الغفلة من الامم الخالیة والقرون الماضیة یا معشر ایاد، این الاباء والاجداد، واین المریض والعواد واین الفراعنة الشداد این من بنی وشید وزخرف ونجد وغره المال والولد واین من بغی وطغی، وجمع فاوعی، وقال انا ربکم الاعلی، الم یکونوا اکثر منکم	اے معشر ایاد! پچھلی قوموں اور گزشتہ نسلوں میں سے جنھوں نے اپنی زندگیاں غفلت میں گنوائیں ان کے لیے ہلاکی ہو۔ کہاں ہیں آباؤ اجداد! کہاں ہیں مریض اور ان کے عیادت کرنے والے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے فلک بوس عمارتیں بنوائیں جنھوں نے آراستہ کیا اور سنوارا اور مال و اولاد کی محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا! کہاں ہیں وہ جنھوں نے سرکشی کی اور اکڑے اور سمیٹا اور کہا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی! کیا وہ مال میں

اموالا واطول منکم اجالا طحنهم الثری بکلکله ومزقهم بتطاوله فتلك عظامهم بالیه وبیوتهم خاویه عمرتها الذئاب العادیه کلا بل هو المعبود۔	تم سے زیادہ نہ تھے؟ عمروں میں تم سے بڑھ کر نہ تھے؟ لیکن کیا ہوا؟ زمین نے ان کو پیس دیا اور اس کی دست درازیوں نے ان کو پامال کر دیا۔ یہ ان کی بوسیدہ ہڈیاں ہیں۔ ڈھے ہوئے مکانات ہیں جن کو خونخوار بھیڑیوں نے آباد کر رکھا ہے! ہرگز نہیں صرف وہی معبود ہے۔

اس کلام میں جملہ خوبیوں کے باوجود ایک نقص بھی ہے۔ وہ یہ کہ خطیب نے قانون مجازات کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن جب ان امور کا ذکر کرتا ہے تو عدل کے پہلو کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً فتلك بیوتهم خاویة بما ظلموا (یہ ان کے مسمار شدہ مکانات ہیں بوجہ اس کے کہ انھوں نے ظلم کیا) قس بن ساعدہ نے جہاں "بغیٰ وطغیٰ" کہا ہے اس حقیقت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ لیکن صرف زوال نعمت کے ذکر پر پہنچ کر رک گیا۔ جزاء کے معاملہ کی طرف اس کی نظر نہیں گئی۔ قرآن مجید عموماً جزاء پر ان واقعات سے استدلال کرتا ہے جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آئے۔ دوسرے صحف آسمانی کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں بھی قانونِ مجازات کی دلیل کے طور پر گزشتہ قوموں کے احوال و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ باقی رہی زمانہ کی بے ثباتی اور بے وفائی تو یہ تو عربی شاعری کا نہایت پامال مضمون ہے۔ شعرا میں عدی بن زید کا تو گویا خاص مضمون ہی یہی ہے۔

اعاذل ما یدریك ان منیتی الی ساعة فی الیوم او فی ضحی غد

(اے ملامت گر تجھے کیا معلوم کہ میری موت آج کسی گھڑی میں آجائے گی یا کل)

اعاذل ان الجهل من لذة الفتی وان المنایا للرجال بمرصد

(اے ملامت گر رندی و شاہد بازی نوجوانی کی لذتوں میں سے ہے اور انسان کی موت ہمیشہ گھات میں ہے)

کفی زاجرا للمرء ایام دهره تروح له بالواعظات تغتدی

(آدمی کی تنبیہ کے لیے ایام روزگار کافی ہیں، جن کی ہر صبح و شام صحیفۂ عبرت کا ایک نیا ورق الٹتی ہے)

دیکھو کس قدر حکیمانہ باتیں ہیں تاہم جزاء اور دار آخرت کا کوئی ذکر نہیں۔

۴۔ زمانہ کی قسم کیوں کھائی

پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے اگر انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا انہی حقائق کو یاد دلانے کے لیے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت سے لازماً ان کو بھی دوچار ہونا ہے۔

پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پہ بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روز قیامت کی بازپرس، اور جزائے اعمال کے قانون سے

بالکل غافل ہے۔ اس معاملہ میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے لیکن بجائے اس کے کہ اس کو جلد سے جلد بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا ہے اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے ظاہر ہے کہ ایسے تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت و نادانی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔

ٹھیک یہی حال اس غافل انسان کا ہے جو وقت کی قدر و قیمت سے غافل ہے۔ جب موت کی گھڑی اس کے سر پر آجائے گی، حسرت و نامرادی کے سوا اس کے جیب و دامن میں کچھ نہ ہوگا۔ قرآن مجید جس نامرادی کا بار بار ذکر کرتا ہے اس کی حقیقت یہی ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (الانعام: ۳۱-۳۲)

بے شک وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب قیامت کی گھڑی ان کے سر پر دفعۃً آجائے گی وہ کہیں گے افسوس ہماری کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی ہے۔ اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہوں گے اور آگاہ کہ وہ برا بوجھ ہوگا۔ اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر لہو و لعب اور یقیناً دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کریں۔

اور یہ جو قسطلانیؒ وغیرہ بعض علماء نے "والعصر" کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اقسم بالدھر لاشتمالہ علی العجائب والعبر" زمانہ کی قسم اس لیے کھائی کہ زمانہ گوناگوں نیرنگیوں اور عبرتوں کا مجموعہ ہے، تو ان کا مطلب بھی وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے کیونکہ اسی تھوڑی سی گزر جانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیات چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبط نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس فنا ہو جانے والے باطل سے بے نیاز اور اس باقی رہنے والے حق پر ثابت قدم رہ کر جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر محض بطریق مثل ہی نہیں آیا ہے بلکہ یہ قانون مجازات اور غفلت سرشت انسانوں کی نامرادی پر ایک محکم حجت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں تقویت صبر اور تقویت تقویٰ کا بھی ایک پہلو ہے۔ غور کرو، قرآن کے ایک لفظ نے کس خوبی اور ایجاز کے ساتھ فوز و فلاح اور خسران و نامرادی کے دونوں پہلو سامنے رکھ دیے ہیں۔

۵۔ لفظ وَتَوَاصَوْا سے خلافت کا وجوب

انسانوں کی عام نامرادی بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی خصوصیات بیان کیں جو اس حیات چند روزہ کے بدلے ابدی مسرت و کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی تین خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایمان، عمل صالح اور تواصی۔ ان تین صفتوں نے

اپنے اندر دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں۔ جو لوگ اس کلام پر غور کریں گے وہ محسوس کریں گے کہ باوجود غایت ایجاز ان الفاظ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی قسم کی کوئی بات ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ گئی ہے۔ ایمان تمام عقائد کا شیرازہ ہے۔ عمل صالح تمام شریعت کا مجموعہ ہے اور تواصی ایک رتبہ کمال و فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے مخصوص فرمایا اور اس امت میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو اس کے رہنما ہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری انہی پر ہے۔

اس تواصی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی ہے اور ان کو اختلاف و نزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کر کے بھائی بھائی بنا دیا ہے۔

جب تک امت کے اندر یہ نظام باقی رہا، اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو دفعۃً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ قرآن کی آیت ذیل میں اس فریضہ کی تفصیل کی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ...... (الی قولہ تعالیٰ) ...... كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۰۲-۱۱۰)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حالت میں کہ مسلم ہو۔ اور اللہ کی رسی سب متحد ہو کر مضبوط پکڑو۔ اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کے فضل کو اپنے اوپر یاد کرو جب تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں کو باہم جوڑا اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے اس سے تم کو بچایا اسی طرح اللہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم ہدایت پاؤ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک امت دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہو اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق ہو گئے اور کھلی کھلی نشانیاں پانے کے بعد انھوں نے اختلاف کیا یہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب عظیم ہے ...... (الی قولہ تعالیٰ) ...... تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیے اٹھائے گئے ہو۔ تم نیکی کا حکم دو گے، برائی سے روکو گے، اللہ پر ایمان لاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے اہم فرائض میں سے ہے چنانچہ اس کے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصلی ذمہ داری، جیسا کہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ سے متبادر ہوتا ہے۔ امت کے لیڈروں

پر ہے۔ البتہ تواصی ایک فرض عام ہے جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔

اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں، پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعتِ امیر پر منحصر ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کے لیے حق و صبر کی پوری تفسیر ضروری ہے اس لیے اب ہم اس کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۶۔ "حق" و "صبر" کی شرح اور ان کا باہمی تعلّق

حق کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی عام دوسرے معنی خاص۔ معنی عام کی تشریح ہم اس وقت کریں گے جب سورہ کی تفسیر کا عمومی پہلو بے نقاب کریں گے۔ معنی خاص کی تشریح یہاں کرتے ہیں۔

حق کے خاص معنی مواسات و ہمدردی کے ہیں۔ اس کے لیے دوسرا معروف لفظ "مرحمۃ" ہے۔ مواسات و ہمدردی کے لیے اس لفظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دوسروں کے نزدیک محض ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت رکھتی ہے، عرب اپنے اوپر اس کو ایک حق واجب خیال کرتے تھے۔ شعرا نے اکثر اس کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ ربیعہ بن مکروم کا شعر ہے:

یھینون فی الحق اموالھم اذ اللزبات التحین المسیا

(یعنی زمانہ قحط میں اونٹ ذبح کر کے بھوکوں کو کھلاتے ہیں)

سوید بن ابی کاہل الیشکری کہتا ہے۔

من اناس لیس من اخلاقھم عاجل الفحش ولا سوء الجزع

(ایسی قوم میں سے ہیں جن کے اندر عاجلانہ بدگوئی اور گھبراہٹ نہیں ہے)

عرف للحق ما یغنی بہ عند مر الامر ما فینا خرع

(حقوق کو خوب پہچانتے ہیں ان کی ادائیگی سے عاجز نہیں آتے اور کٹھن وقتوں میں ہم کمزور نہیں ہوتے)

لبید نے کہا ہے:

فان تقبلوا المعروف نصبر لحقکم ولن یعدم المعروف خفا ومنسما

کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ پس گویا "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" بالکل "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ" کے ہم معنی ہے اور دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔

اب دیکھو تمام بھلائیوں اور نیکیوں میں سے قرآن نے اس نیکی کو کس طرح چھانٹ لیا ہے جو درحقیقت سب نیکیوں کی اصل اور سب کا خلاصہ ہے۔ صرف مرحمت ہی کا رشتۂ محبت ہے جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے دلوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتا ہے اور سب کو جود و کرم اور فیاضی و ہمدردی کے جوش سے معمور کر کے زندہ و حساس بنا دیتا ہے۔ پہلی سورہ (سورہ تکاثر) میں عشق

دنیا کی منافسات کا ذکر تھا جو تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس سورہ میں دعوت حق و مرحمت کا ذکر فرمایا جس نے یہ جڑ بیک قلم کاٹ دی۔ اس کے بعد صبر کی تعلیم فرمائی کیونکہ جب تک آدمی لوگوں کو پہنچائی ہوئی اذیتیں جھیلنے اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی اور درگزر کرنے کا عادی نہ ہو جائے اس وقت تک صحیح مرحمت وجود میں نہیں آ سکتی۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (الشوریٰ - ۴۳) — اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو یہ کام ہمت کے ہیں۔

اس آیت میں دیکھو معاف کرنے کا ذکر صبر کے ساتھ ہوا ہے۔ اور کچھ اسی مقام کی خصوصیت نہیں، ان دونوں کا ذکر قرآن مجید میں اکثر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ بالکل دو توام چیزوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ آل عمران کے خاتمہ کی آیت ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ اس آیت میں اس امت کی شیرازہ بندی کی گئی ہے، اور اگر غور سے دیکھو گے تو نظر آئے گا کہ اس شیرازہ بندی میں اصلی عامل کی حیثیت صبر ہی کو حاصل ہے۔ اسی سے مشابہ آیت ذیل بھی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — مگر وہ جنھوں نے صبر کیا اور جنھوں کے بھلائیاں کیں۔

پس سورۂ والعصر میں حق و صبر کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے دو بنیادی نیکیوں کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ تفسیر سورۂ ماعون اور تفسیر سورۂ کوثر[1] میں ہم بیان کریں گے کہ اللہ اور مخلوق کی محبت ایمان کا پہلا رکن ہے اور اسی چیز کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے دو لفظوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی اسی اہمیت کی وجہ سے صبر کا ذکر ان دونوں کے ساتھ بھی آتا ہے۔ نماز کے ساتھ قرآن مجید میں کئی جگہ نظر آتا ہے مثلاً:

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ) — اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا (طٰہٰ - ۱۳۲) — اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ قوت اور عزم کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:

وغمرۃ موت لیس فیھا ھوادۃ یکون صدور المشرفی جسورھا

(اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں، جن پر تلواروں کے پل ہیں)

صبرنا لہ فی نھکھا ومصابھا باسیافنا حتی یبوخ سعیرھا

(ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے)

اصبغ کا شعر ہے:

یا ابن الحجاجحۃ المدارۃ والصّٰبرین علی المکارہ

(اے شریف سرداروں اور شدائد پر ثابت قدم رہنے والوں کی اولاد)

---

[1] تفسیر سورۂ ماعون نامکمل رہ جانے کے سبب سے شائع نہ ہو سکی۔ البتہ سورۂ کوثر کی تفسیر کا ترجمہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔ (مترجم)

زہیر بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے:

فعو دالجیاد واصهار الملوك وصبر فی مواطن لو کانوا بها سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری اور پادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھے۔

صبر کے اصلی معنی قرآن مجید نے خود بھی کھول دیے ہیں۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ — اور صبر کرنے والے سختی میں، تکلیف میں اور لڑائی کے وقت

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کیے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ۔ اور درحقیقت تمام مصائب و شدائد کے یہی تین سرچشمے ہیں۔ لوگوں کی ایذا دہی پر صبر کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ الآیۃ

اخلاق انسانی کی سب سے زیادہ حسین شکل یہ ہے کہ وہ شجاعت اور نرم خوئی کا ایک دل آویز پیکر ہو۔ اب غور کرو رحمت اور صبر کی یکجائی نے کس طرح یہ خوبصورت پیکر آپ سے آپ تراش دیا ہے۔ اس کی تفصیلات بارھویں فصل میں آئیں گی۔

پھر دیکھو، غیر معمولی ایجاز کے باوجود، کلام کی وسعت اور جامعیت کا کیا حال ہے! مکارم اخلاق کے تمام ابواب دو لفظوں میں سمٹ آئے ہیں۔ دو لفظوں میں تمام برکتوں کا خزانہ ہے، طالبوں کے لیے رہبری ہے، دل کے تمام روگوں کا علاج ہے، نفس کے تمام وسوسوں سے نجات کا نسخہ ہے۔

اب ہم سورہ کی اس عام اور وسیع تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی طرف اس کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

۷۔ سورہ کی وسیع تاویل اور جوامع الکلم میں سے ہونے کی وجہ

چھوٹی سورتوں کی تاویل و تفسیر میں، ہم جو اس قدر پھیلتے ہیں اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض تعمق و تکلف ہے۔ بلکہ ہم ایسا ان کے معانی کی وسعت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ چھوٹی سورتوں کے وسیع معانی پر مشتمل ہونے کے دلائل اور وجوہ بہت ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ اگر چھوٹی سورتیں وسیع معانی پر مشتمل نہ ہوتیں تو ان کو مستقل سورتوں کی حیثیت نہ دی جاتی۔

۲۔ ان کا نزول زیادہ تر ابتداء میں ہوا ہے اور یہ بیشتر اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ ابتداء میں اصولی باتیں ہی تعلیم کی جاتی ہیں۔ اس بات کو بالاجمال ہم تاریخ قرآن[1] میں لکھ چکے ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا اصول کی طرف خود قرآن مجید نے رہبری فرمائی ہے۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود-۱) — یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ان کی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تفصیل کی گئی۔

۴۔ چھوٹی سورتوں کے جوامع الکلم میں سے ہونے کے اشارات خود ان کی عبارات کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

۵۔ اس باب میں سلف سے بھی ایسے اقوال منقول ہیں، جن سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب نامکمل رہ گئی۔ (مترجم)

نے سورۂ والعصر کی بابت فرمایا کہ اگر لوگ تنہا اسی سورہ پر غور کریں تو ان کے لیے کفایت کرے۔

اب ہم سورہ پر، اس کے عمومی پہلو کو پیش نظر رکھ کر غور کریں گے اور ایمان، عمل صالح، تواصی، حق اور صبر کے معانی اور ان کے باہمی تعلق کی توضیح کریں گے۔

۸۔ ایمان کا حقیقی مفہوم

ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان، لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اٰمنه ای اعطاه امنا (اس کو امن دیا) قرآن میں ہے۔ وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (اور ان کو خوف سے امان دی) اٰمن له صدقه واعتمد علیه (اس کی تصدیق کی۔ اس پر اعتماد کیا) اٰمن به ایقن به (اس کا یقین کیا)

قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ اس کے مشتقات میں سے مومن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔

یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔ عبرانی میں (אמן) (اَمَن) کا مادہ موجود ہے جس کے معنی صدق و اعتماد کے ہیں۔ اسی سے (אָמֵן) آمین ہے جو ایک تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔

ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور عقائد و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پس قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ شخص ہوا جو خدا کا خالص و مخلص بندہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام و آیات پر یقین و اطاعت کی اس کیفیت کے ساتھ مضبوط ہے جس کی بنیاد رضا و محبت پر ہے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان کی کوشش کے لحاظ سے درجے اور مناصب عطا فرماتا ہے۔ جو روح پاکیزگی اور طہارت کی راہ میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے، تقرب الٰہی کے مقامات و منازل میں وہ اسی قدر ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور چونکہ روح کی ترقی کی دو راہیں ہیں۔ ایک علم و عمل کے اندر سے ہو کر نکلی ہے، دوسری قلب و ارادہ کے اندر سے۔ اس لیے علم و عمل کی راہ میں اس کا ہر قدم اس کو ہدایت و تقویٰ سے قریب تر کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ — اور جنھوں نے ہدایت کی راہ پکڑی (یعنی اپنے علم کے مطابق عمل کیا) ان کی ہدایت زیادہ کی (یعنی علم) اور ان کو بخشا ان کا تقویٰ (یعنی صحت ارادہ کیونکہ تقویٰ ہی تمام اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے)

پس ہر علم نافع اور عمل صالح ہدایت و تقویٰ کا دروازہ کھولتا ہے اور علم و عمل کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید

کی ایک سے زیادہ آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ — اور اب تک ایمان تمہارے دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔

یعنی تمہارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس نے علم سے ارادہ اور قول سے عمل کی شکل ابھی نہیں اختیار کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ — وہی لوگ ہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا اور ان کی اپنی طرف سے، روح سے تائید کی۔

یہ ان لوگوں کی باہمی محبت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش میں لانے والی چیز ہے۔

ایک اور مقام میں فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ۔ — اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں۔

ایک جگہ فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء - ۶۵) — پس نہیں، تیرے رب کی قسم، ان کا ایمان معتبر نہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے تمام نزاعی امور میں تم کو حکم بنائیں، پھر تمہارے فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور کلی طور پر اطاعت کریں۔

یعنی جس نے اپنے نفس اور اپنے تمام عزائم و اعمال کو پوری طرح اللہ کے حوالہ نہ کر دیا وہ پکا مومن نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان جن اعمال و عقائد کا مجموعہ ہے، ان میں سے اس نے صرف چند پورے کیے ہیں۔ تمام نہیں پورے کیے۔

اسی مفہوم کی یہ آیت بھی ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ط (الانفال: ۳-۴) — مومن تو وہی ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان کو اس کی آیتیں سنائی جاتی ہیں، ان کے ایمان کو زیادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے روزی بخشی ہے، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچ مچ کے مومن ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے مندرجہ ذیل اوصاف گنائے ہیں:

(۱) اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں پر خشیت طاری ہوتی ہے (۲) آیات الٰہی کے سننے سے ان کا ایمان بڑھتا ہے (۳) اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں (۴) نماز قائم کرتے ہیں (۵) راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ بس یہی لوگ سچے اور راستباز

مومن ہیں۔ اسی کے مشابہ ایک اور آیت ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات) — مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں کسی طرح کا تردد نہ کیا اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

آیت ذیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا لَّا يَسْتَوُونَ ٥ — کیا جو مومن ہے وہ فاسق کی طرح ہو جائے گا؟ (ہرگز نہیں) دونوں برابر نہ ہوں گے۔

دیکھو اس آیت میں، اللہ تعالیٰ نے مومن کو فاسق کا ضد قرار دیا اور تصریح کے ساتھ فرمایا کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔

اس تفصیل کے بعد، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن مجید میں، ایمان کے بعد جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے اور اس کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا ہوگا کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کل کے بعد جزو اور عام کے بعد خاص کا ذکر کر کے تفصیل کی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں، ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے، حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے۔ ایک قول، دوسرے عمل۔ اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی اصل کسوٹی ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا — اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

یعنی اے وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے ہو، عمل سے ایمان لاؤ۔

اسی کے مثل دوسری جگہ ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ٥ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ٥ — کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے اور بے شک ہم نے آزمایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے پس البتہ اللہ معلوم کرے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور معلوم کرے گا ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

پس آمَنُوا کے بعد عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا جو ٹکڑا آتا ہے وہ درحقیقت آمَنُوا کی تفصیل ہوتا ہے۔ البتہ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کو آمَنُوا کا مقابل نہیں قرار دے سکتے۔ کیونکہ ایمان کے معنی، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، القان کے بھی ہیں۔ اس تفصیل سے یہ

حقیقت واضح ہوگئی کہ سچا مومن وہ ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں کا جامع ہو۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتی ہے اسی طرح اعمال سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رکن ہیں۔ ایک علم دوسرا عمل، ان میں اگر ایک کو بھی ڈھا دو گے، اس کی پوری عمارت ڈھ جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اس کے لیے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے۔ جہاں تک نفس علم و یقین کا تعلق ہے، ابلیس کچھ کم نہ تھا تاہم وہ مومن نہ تھا۔ ایسا یقین معتبر نہیں۔ اس قسم کا یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب اور بڑھتا ہے۔ فرعون اور اس کے ساتھی بھی یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یقین ایمان نہ تھا۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (نمل ۱۳-۱۴)

پس جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں آئیں انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور ان کا انکار کیا۔ حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کیا، ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ علم و ارادہ بالکل دو چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں تلازم نہیں ہے۔ بحث علم کی پوری تفصیل سورہ تکاثر کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔[1]

۹- ایمان کے خاص معنی اور اس کا سیاسی مفہوم

لیکن ایمان کے ایک خاص معنی، ایقان کے بھی ہیں۔ قرآن مجید اس معنی میں اس لفظ کو ہمیشہ صیغۂ فعل کی صورت میں لاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے متعلق کو بھی ذکر کرتا ہے۔ مثلاً:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (بقرہ)

ایمان لایا (یقین کیا) رسول اس چیز پر جو اس پر اتاری گئی اس کے رب کے جانب سے اور مومنین۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر (اور کہا) ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور کہا (صمیم قلب سے) ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

قرآن مجید کے اس استعمال سے بعضوں کو خیال ہوا کہ ایمان معتبر و حقیقی یہی ایقان ہے۔ اور یہ ایک یقین محض کی حالت ہے۔ اس وجہ سے عمل سے اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یقین اور عمل دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں، پس عمل یقین کا جزء کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہی رائے ہے جو ایمان و عمل کے باب میں حضرت امام ابو حنیفہؒ نے بھی اختیار فرمائی ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کو مزید تقویت ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک واضح مسئلہ میں تاویل و توجیہ کے نہایت دور از کار پہلو اختیار

[1] افسوس ہے کہ سورۂ تکاثر کی تفسیر مولانا مکمل نہ کر سکے اس وجہ سے وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے (مترجم)

کر لیے گئے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بالکل علیحدہ نوعیت رکھتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک قاضی و فقیہ ان مسائل کو دیکھتا ہے یا جس نگاہ سے امیر اسلام وراثت و نکاح اور خراج و جزیہ وغیرہ کے معاملات اور سیاسی مسائل کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ قانون و سیاست کی نگاہ ہے، جو حکمت و فلسفہ کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے۔ یا جو مسلمانوں کے شعار اور ان کے ظاہر حالات میں بالکل ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے اشخاص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہیں۔ ان میں صادق و کاذب اور متقی و فاجر کی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس قانونی ایمان پر سب برابر ہوں گے۔ اس میں کمی بیشی نہیں واقع ہوتی، کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندہ کے درمیان کے باطنی احوال و معاملات کی جستجو نہیں کیا کرتی۔ یہ معاملات صرف قیامت کے دن بے نقاب ہوں گے۔ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ ۚ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَأْوَاكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (۱۲-۱۵)

جس دن تم دیکھو گے ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں کو، دوڑتی ہوئی چلے گی ان کے آگے اور ان کے داہنے ان کی روشنی (اور ہم کہیں گے) خوش خبری ہے تم کو آج کے دن۔ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔ جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے، ذرا مہلت دو ہم کو، ہم بھی تمھارے نور سے روشنی لے لیں۔ ان سے کہا جائے گا، لوٹ جاؤ پیچھے اور ڈھونڈو روشنی۔ پھر کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان ایک دیوار اس میں ہوگا ایک دروازہ اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب یہ لوگ ان کو پکاریں گے کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ کہیں گے کیوں نہیں! لیکن تم نے فتنہ میں ڈالا اپنے آپ کو، اور راہ دیکھتے رہے اور شک میں پڑے رہے اور تم کو دھوکے میں رکھا آرزوؤں نے۔ یہاں تک کہ آپہنچا اللہ کا حکم اور اللہ کے بارے میں تم کو دھوکے میں رکھا شیطان نے۔ پس آج نہیں لیا جائے گا تم سے فدیہ اور ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا جہنم ہے وہی ہے تمھاری رفیق اور برا ٹھکانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دنیا کی زندگی میں تو مومنین کے ساتھ ہے لیکن آخرت میں ان سے علیحدہ کر دی

جائے گی اور اس کا حشر کفار کے ساتھ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب میر اسلام مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو اگرچہ مسلمان نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، معاملات میں بالکل یکساں درجہ دے۔ پس امام ابوحنیفہؒ نے اس بحث میں ایمان سے اس کے خاص مفہوم یعنی ایقان کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ مجرد اقرار و اظہار کو مراد لیا ہے یعنی ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا؟ یہ سوال نہ تھا کہ علم و عمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا۔ اگر سوال موخر الذکر صورت میں ہوتا تو اس کا جواب محض ایک ہی ہوتا، کیونکہ اس بارہ میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ایمان علم و عمل دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے۔

اب غور کرو اس بارہ میں ایک جج کا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ وہ ایمان کو صرف قول کے معنی میں لے گا اور وہ ایسا کرنے میں ہرگز کوئی غلطی نہیں کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ قول کسی کمی بیشی کا محل نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر میں ایمان سے صرف وہ ایمان مراد ہوتا ہے جو ہماری عدالتوں میں احکام قضا کے اجراء و نفاذ کی بنیاد بن سکے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات سے کوئی بحث نہیں ہوا کرتی۔ اب اگر قرآن ایمان کی کمی اور زیادتی کی تصریح کرتا ہے تو اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے اور قرآن اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے۔ بلاشبہ قرآن سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایقان و عمل دونوں ہر حالت میں یکساں نہیں رہتے بلکہ ان میں مختلف حالات کے ماتحت تغیر و تفاوت ہوتا رہتا ہے۔ یہ کبھی کم ہوتے ہیں کبھی زیادہ۔ عقل سلیم اس صداقت کی تائید کرتی ہے۔ پچھلی فصل میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں۔

۱۰۔ عمل صالح کی حقیقت

"عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ایک جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمال حسنہ سمٹ آتے ہیں اور یہ اس قدر واضح مسئلہ ہے کہ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہاں ایک دقیق نکتہ بھی ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو "صٰلِحٰتِ" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ حسنہ ہی ہیں یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا، جو انسان کے لیے زندگی اور نشو و نما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعہ سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک ترقی کر سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ یہی چیز ہے جس کے ذریعہ سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے انسان وجود میں آیا ہے۔ اور جس کو انسان کی فطرت قرار دیا گیا ہے۔ اور جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔

اور آیت ذیل میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسان کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یہاں عبادت سے طاعتِ الٰہی مراد ہے، جس پر تمام شخصی و اجتماعی صلاح و فلاح کا دار و مدار ہے۔ اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی ایک مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔ کیونکہ خدا نے اس دنیا کو بازیچۂ اطفال نہیں بنایا ہے۔ بلکہ ایک خاص نظام حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اس نظامِ حکمت کے ماتحت ہو۔ اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔

اور یہ جو تم اس کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تصادم دیکھ رہے ہو تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس کے اندر کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ یہ کشمکش اور تصادم بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشو و نما ہی کے لیے ہے۔ اس کشمکش ہی سے تغیرات کا وہ سلسلہ پیدا ہوتا ہے جو ہر پرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قائم رہ سکے۔ قرآن مجید میں صاف تصریح ہے کہ انسان کی ترقی عمل صالح پر مبنی ہے اور تمام عالم، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ایک خاص حکمت کی طرف جا رہا ہے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (فاطر: ۱۰)

اسی کی طرف عروج پاتا ہے کلام طیب اور عمل صالح اس کو رفعت بخشتا ہے (انسان کا یہ عروج عمل صالح اور اس اعلیٰ مقصد کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کی خلقت کا منشا ہے) اور جو لوگ برائی کی سازشیں کرتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور ان لوگوں کی تدبیر نامراد ہوگی (کیونکہ بری تدبیریں اس حق کے خلاف ہیں جو کائنات کی اصلی روح ہے اس لیے جو کوشش اس کے مٹانے کے لیے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو فروغ نہ دے گا کیونکہ اس کائنات کی تخلیق کا منشا درحقیقت ایک عظیم الشان حکمت ہے جس کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں حق ہے)

اس اصول کی ایک سے زیادہ آیات میں تشریح ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○ (الانبیاء: ۱۶-۱۸)

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کرتے ہوئے۔ اگر ہم چاہتے کہ بنائیں کوئی کھلونا تو ہم اس کو بنا لیتے اپنے پاس، اگر ہم کو ایسا کرنا ہی ہوتا بلکہ ہم ماریں گے حق کو باطل پر۔ پس وہ اس کا سر توڑ ڈالے گا اور باطل دفعتہً برباد ہو جائے گا اور تمہارے لیے خرابی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی کہ زمین کی وراثت صالحین کے لیے کیوں مخصوص ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسدین اس مقصد کے خلاف چلتے ہیں جو اس عالم کی تخلیق کا منشاء ہے اور صالحین اس روش پر چلتے ہیں جو اس مقصد کی طرف

رہنمائی کرتی ہے۔اسی وجہ سے فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ (جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلائیاں کیں البتہ ہم ان کو داخل کریں گے صالحین میں) یعنی صلحاء کے زمرہ میں جو درحقیقت انبیاء صدیقین اور شہداء کا زمرہ ہے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں مفسدین کی ہلاکت اور صالحین کے لیے برکت کا ذکر اکثر آیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ	اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے
اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اِنَّ	صالح بندے ہوں گے۔ بے شک اس میں پیام (یعنی پیام خوشخبری)
فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ۝	ہے عبادت کرنے والی قوم کے لیے۔

"عبادت کرنے والی قوم" یعنی وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعدار ہو کیونکہ تمام صلاح و تقویٰ کی جڑ جیسا کہ معلوم ہو چکا اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعداری ہی ہے۔ نافرمان شخص صرف اپنا ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کا دشمن ہوتا ہے۔اس کے پیش نظر صرف اپنا نفس ہوتا ہے۔اس وجہ سے وہ اللہ کے احکام و قوانین کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس بات کو ذرا نہیں سوچتا کہ اس کی بہبود درحقیقت سب کی بہبود سے وابستہ ہے۔ باقی رہے صالحین تو وہ زمین کے نمک ہیں۔ تمام عالم کی اصلاح و ترقی انہی کے دم سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں تمام عالم کے لیے سوچتے اور کرتے ہیں اور صرف اپنے ابنائے زمانہ ہی کے لیے نہیں کرتے بلکہ ان نسلوں کے لیے بھی کرتے ہیں جو ان کے بعد آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ وراثتِ عالم اور خلافتِ الٰہیہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

۱۱- حق ہمارے عروج کی غایت ہے

حق اصل میں تو موجود و قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے معانی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال عام ہے۔

۱- وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲- وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔

۳- وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔

قرآن مجید نے اس لفظ کو ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ بے شک اہل دوزخ کا یہ جھگڑا ضرور واقع ہو گا۔ فَرُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وہ اپنے حقیقی مولیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے یعنی ایک واجب الادا قرض کی حیثیت سے۔

باقی رہا وہ خاص مفہوم یعنی ضعفاء کی ہمدردی جس کا ذکر ہم نے پانچویں فصل میں کیا ہے تو وہ اسی عام معنی سے نکلا ہوا ہے گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر صاحبِ استطاعت پر لازم ہے اور جو ہر مستحق کو حاصل ہونا چاہیے۔ جو عقل

کے نزدیک مسلم اور تمام لوگوں کے نزدیک بالکل متعین و معروف ہے۔ اسی سبب سے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی بات جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوتی ہے اور جو تمام معقول لوگوں کے اندر ایک قانون مسلم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حق کے معنی غریبوں کی ہمدردی کے لیے جائیں تو اس کے اندر ان تمام معانی کی جھلک ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حق اپنے وسیع معنی میں اس چیز کو کہیں گے جو عقل و دل دونوں کو ایک ساتھ محبوب ہو اور جو علم و عمل دونوں پر یکساں طور پر حاوی ہو جائے اور نیز ظلم و فساد کی ضد ہو۔

اب ہم حق و صبر کی حقیقت بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان دونوں کے درمیان جو باہمی تعلق ہے وہ واضح ہو سکے اور اس سورہ کا نظم اس کے معنی کی وسعت کے لحاظ سے سامنے آ جائے۔

۱۲- حق و صبر کی توضیح اور ان کا باہمی تعلق

نجات کا دار و مدار عقلی اور اخلاقی قوتوں کی اصلاح پر ہے۔ عقل اور دل دونوں کے سختی اور نرمی کے اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی نرمی کا پہلو یہ ہے کہ وہ حق کے سامنے فوراً جھک جانے کے لیے مستعد رہے، وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو۔ اور قلب کی نرمی یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق کی ہمدردی سے ہمیشہ سرشار رہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ حق پر ایمان لاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ، اس کی صفات، اس کی آیات پر، اور قلب اپنی بندگی کا احساس کرتا ہے اور پھر بتیابانہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھتا ہے اور خلق کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے اس کے جوش و احساس سے معمور ہو جاتا ہے۔

عقل کی شدت کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، ثابت قدم رہے۔ اور اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑ دے۔ اور اس پہلو سے قلب کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب و شدائد کے مقابل میں ڈٹا رہے اور اپنے قدم جادہ مستقیم سے نہ ڈگنے دے اور قابو پا جانے کے بعد عفو و درگزر سے کام لے۔

یہ حق کا تعلق قلب و عقل سے ہوا۔ بالکل یہی حال صبر کا ہے۔ وہ بھی عقل اور دل دونوں سے لگاؤ رکھتا ہے۔

خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل مطلوب و محبوب ہے، اور صبر اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ	بے شک جن لوگوں نے کہا (یعنی سچائی کے ساتھ) ہمارا رب اللہ ہے (یہ قول یقین و
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	طاعت دونوں کا مجموعہ ہے کیونکہ جو ربوبیت کا اقرار کرے گا وہ یقین و طاعت دونوں سے معمور ہو گا) پھر اس پر ثابت قدم رہے۔

یعنی حق کو قبول کیا پھر اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اہلِ بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جمے رہنا ہے۔ اب غور کرو، دو لفظوں، حق و صبر، کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی اور اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ صبر صرف بھلائیوں کو حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں مطلوب ہوتا ہے بلکہ بھلائیوں کو حاصل کر لینے کے بعد ان پر قائم رہنے اور ان کو قائم رکھنے کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان مزید نعمت کا مستحق ہو سکے۔ صبر درحقیقت تمام بھلائیوں کا معاون ہے۔ اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ اس کو انسان کی ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو ابتداء ہی میں صبر کی تعلیم فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کا جو واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ سے صبر ہی کا مطالبہ کیا اور اسی چیز میں ان کا امتحان لیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل پندرھویں فصل میں آئے گی۔ یہاں محض اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ حق و صبر درحقیقت سیرِ باطن کی راہ میں ہمارے دو قدم ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں درحقیقت ایک ہی جڑ سے کئی شاخیں نکلی ہیں۔ ایمان ایک اصل اور مرکزی حیثیت سے تھا، اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ، دل اور دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس وجہ سے اس کی محبت کے نتیجہ کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ کیونکہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ شے محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ ثابت قدمی و استقامت محبوب کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہو گی اس کے لیے اسی قدر پامردی اور استقلال کا جوش ابلے گا مدافعت، غضب، اور غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لیے یکساں نہیں ہوا کرتا بلکہ مختلف درجہ کا ہوتا ہے۔ جو شے دل کو جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبہ حمیت و غیرت بھڑکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے غضب و انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے اس وجہ سے جو لوگ حق کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تم کو عزیز و محبوب ہو گی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لو گے؟ اس کی حمایت کے لیے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی! ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے، ماں کو بچہ کی حمایت میں قربان کر دیتی ہے یہی جوش حمایت و غیرت قوموں میں اپنے قومی و وطنی حقوق و مقاصد کے لیے ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے تو اپنی کمزوریوں سے وہ ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبت حق سے پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ "حق" جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے صبر کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ — پس ثابت قدم رہو، بیشک اللہ کا وعدہ ضرور واقع ہو گا۔

حق و صبر کے باہمی تعلق کے ان پہلوؤں کو برابر پیش نظر رکھو۔

۱۳- عمل اور تواصی کا باہمی تعلق

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود بھی اہل حق و صبر ہیں اور ان چیزوں پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو ان کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تفصیل آیت کے اندر موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ اولاً تو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے اندر یہ بات موجود تھی ثانیاً وعظ بے عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس مدح کے موقع پر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ دوسروں کو تو حق و صبر کی نصیحت کریں گے اور خود ان اوصاف سے محروم ہوں گے۔

'اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے تواصی وجود میں آیا کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کے لیے صبر و استقامت کی تمام کڑیاں بھی سہنے پر آمادہ ہو گا، اس کے بارہ میں لازماً اس کا علم، اس کی محبت، اور اس کی غیرت ہر چیز بڑھ جائے گی۔ اور اب وہ صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے عشق کرے۔ اور جہاں کہیں بھی وہ حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا تڑپ اٹھے گا۔ اور ایک غیور اور شریف انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ حق کی حمایت کے لیے آمادہ ہوں اور اس کا یہ دوسروں کو ابھارنا بھی درحقیقت خود اس کے اپنے ہی جذبہ حمایت حق کا ایک قدرتی نتیجہ اور اس کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں تواصی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے ایک جزء اور اس کی توضیح کی حیثیت سے فرمایا ہے۔'

علاوہ ازیں اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ عمل صالح ہی تمام امن اور تمدن کی بنیاد ہے۔ اس اعتبار سے بھی دیکھیے تو عمل صالح کا سب سے اہم جزء حق و صبر کی دعوت و نصیحت ہی کو ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کو ایک اور جگہ بھی نہایت لطیف طریقہ پر جمع کیا ہے۔ فرمایا ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى — نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو۔

اس آیت میں 'بر' درحقیقت حق کے قائم مقام ہے اور 'تقویٰ' صبر کی ایک دوسری تعبیر ہے اس لیے کہ تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو لغزش کے مواقع پر حمایت حق پر ثابت قدم رکھنا۔

۱۴- فرضِ دعوت اور آزادیِ قول

گزشتہ صفحات میں عمل صالح، حق، صبر اور تواصی وغیرہ کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک سورہ کے چند لفظوں کے اندر سیاست، تعاون اور اتحاد معیشت کے بہت سے اصول و فرائض بیان فرما دیے ہیں۔ اور معاشرہ کے عام معاملات و مسائل سے الگ تھلگ رہنے کے خیال کا نہایت واضح طور پر ابطال کیا ہے اور چونکہ یہ سورہ صرف بنیادی اور اصولی باتوں کے بیان کے لیے مخصوص تھی، اس وجہ سے اس میں تواصی کا ذکر کیا جانا ہمارے دعویٰ پر صاف حجت ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک دوسرے کو حق و صبر کی نصیحت کرنے کا فرض عاید کیا ہے تو لازماً ہم کو اظہارِ حق کے لیے تقریر کی آزادی بھی بخشی ہے۔ چنانچہ ہم اسلام کے اصولوں میں یہ بات پاتے ہیں کہ ایک طرف تو امت پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ امیر کی کامل اطاعت کرے اور دوسری طرف اس پر یہ ذمہ داری بھی عاید کی گئی ہے کہ وہ حق کا اعلان کرتی رہے اور نصیحت کا کلمہ کہنے میں ہر خوف سے بے پروا ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہدا کے لقب سے ممتاز فرمایا، جس کے معنی ہیں حق کی گواہی دینے والے۔ خلفائے راشدینؓ کا یہ حال تھا کہ بڑھیا عورتیں ان کو برسرِ منبر ٹوک دیتی تھیں اور وہ ان کی نصیحتوں کو بخوشی قبول کرتے تھے۔ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شوریٰ کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو کلمۂ حق کہنے کی جرأت ہو۔ چنانچہ صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی رائیں پوری بے خوفی سے ظاہر کر دیتے تھے اگرچہ ان میں سے کسی کی رائے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف ہو۔

لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ آزادیِ رائے کو فتنہ و فساد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا اصلی فرض بر و تقویٰ کے لیے تعاون ہے۔ اس اصلِ عظیم کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ اس وجہ سے اگر کبھی ایسا ہو کہ ہم کسی معاملہ میں کوئی رائے دیں اور ہماری وہ رائے نہ مانی جائے تو ہم کو محض اتنی سی بات کے سبب سے ملک کے اندر فتنہ و فساد برپا کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اطاعتِ امر سے انکار کا حربہ آخری حربہ ہے۔ جب تمام اسلحہ بیکار ہو جاتے ہیں، اس وقت یہ ہتھیار اٹھایا جاتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب تمام جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو۔ آیت وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ الخ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اس لیے یہاں سرسری اشارہ کافی ہے۔

۱۵۔ حق و صبر کی مزید توضیح

اگر پچھلی فصلوں کو تم نے بغور پڑھا ہے تو یہ بات بالکل صاف نظر آ گئی ہوگی کہ حق و صبر کی حیثیت درحقیقت دو عظیم الشان پہاڑوں کی ہے جن پر شریعتِ اسلامیہ کے ستون اور اس نظامِ الٰہی کے ارکان قائم ہیں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ حق سے مراد حکمت و عدل ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (المومنون - ۷۱)

اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین دونوں درہم برہم ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا اس زمین کی خلافت اور نبوت و شریعت کی نعمت کسی قوم کو بخشتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حق کی اطاعت کرنے والی اور قسط کو قائم کرنے والی بنے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ

اے ایمان والو عدل کے قائم کرنے والے بنو، اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے (یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ یہ گواہی خود تمھارے اپنے خلاف پڑے۔

قسط سے مراد حق ہے اور اس کا تعلق جس طرح عمل سے ہے اسی طرح علم سے بھی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ (اور اہلِ علم عدل پر قائم) دوسری جگہ فرمایا وَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (اور ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر) ایک جگہ ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (کہہ دے، میرے رب نے عدل کا حکم دیا ہے) وَالَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ (اور جو لوگ عدل کا حکم دیتے ہیں) پھر فرمایا یَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ (حق کے ساتھ رہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں) اسی طرح قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (اور کہا اے میرے رب حق کے ساتھ فیصلہ کر) ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ (پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا) فَاحْكُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ (پس ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر) وَاللّٰهُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ (اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ضروری قرار دیا کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی حق کی بنیاد پر قائم کی ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۝ (صٓ: ۲۶-۲۷)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو (یعنی قسط کے ساتھ) اور خواہش کے پیچھے نہ چلو (کیونکہ یہ حق کے راستہ سے انحراف ہے) کہ تمھیں اللہ کے راستہ سے ہٹا دے (اس آسمانی بادشاہت کے راستہ سے جس کے تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ مقرر کیے گئے ہو) بیشک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹک جائیں گے ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے حساب کے دن کو فراموش کر دیا (حساب کا دن یعنی ظالموں کے بدلہ پانے کا دن) اور ہم نے نہیں پیدا کیا، آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد (پھر اپنی مخلوق کے لیے کیسے پسند کر سکتا ہوں کہ وہ حق کے راستہ سے منحرف ہو جائے) یہ (یعنی آسمان و زمین کا بے مقصد باطل پیدا ہونا) ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا (یعنی اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کا انکار کیا)

اب صبر پر غور کرو، جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب بخشی پہلے ان کے صبر کا امتحان لیا اور جب وہ اس امتحان میں پوری اتریں تو اپنی عزت و نعمت کے تاج سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ اگر کوئی عظیم الشان پل یا کوئی بلند عمارت تعمیر کرنی ہو تو اس کے لیے سب سے پہلے سخت زمین کی تلاش ہوتی ہے جس پر ایک ٹھوس بنیاد قائم کی جا سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قوموں کے انتخاب کے معاملہ میں ایسا ہی کرتا ہے۔ پہلے ان کو مصائب و شدائد سے آزماتا ہے جب اس امتحان میں وہ بالکل پکی ثابت ہوتی ہے تب اپنی امانت ان کے حوالہ کرتا ہے اور ان کو ایک نئی امت کی صورت میں نئی طاقتوں سے مسلح کر کے کھڑا کرتا ہے اور ان کے تمام دشمنوں کو پامال کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانونِ آزمائش کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ

اور ہم تم کو آزمائیں گے۔ یہاں تک کہ جان لیں تم میں سے مجاہدین کو اور ثابت قدموں کو اور جانچ لیں تمھارے احوال کو۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُھَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۴۰-۱۴۲)

اگر تم کو زخم پہنچا تو غم کی بات نہیں، تمھارے مخالفوں کو بھی زخم پہنچا اور یہ زمانہ لوگوں کے درمیان ہم پھیر بدل کرتے رہتے ہیں، اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو تم میں سے ایمان لائے (سچ مچ) اور بنائے تم میں سے شہداء (یعنی ائمہ عدل) اور اللہ نہیں دوست رکھتا ظالموں کو اور تاکہ پاک صاف کرے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک نہیں معلوم کیا اللہ نے ان لوگوں کو جو تم میں سے مجاہد ہیں اور نہیں معلوم کیا ان لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

اور بنی اسرائیل کی سرگزشت سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ ان کی عزت و ذلت کا مدار تمام تر صبر ہی پر تھا۔ اسی چیز کے اپنے اندر پیدا کرنے سے انھوں نے عزت و سرداری حاصل کی اور پھر اسی صفت کے کھو دینے سے ان کی ساری عزت و شوکت برباد ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو جو کچھ بخشتا ہے ان کے اعمال کے اعتبار سے بخشتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (جو اللہ کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (اللہ ثابت قدموں کو دوست رکھتا ہے) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (اور ہم نے ان میں رہنما بنائے جو ہدایت کرتے تھے ہمارے حکم سے جب کہ وہ ثابت قدم رہے۔

انبیائے کرام کے حالات پڑھو اس سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے ایک مدت تک آزمائشیں جھیلیں اور مصائب برداشت کیے یہاں تک کہ جب ان کی استقامت کی پوری آزمائش ہو گئی تب اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ

پس ثابت قدم رہو جس طرح ثابت قدم رہے انبیاء اولوالعزم اور ان کے لیے (کفار کے لیے) جلدی نہ کرو۔

یعنی ان پر عذاب یا غلبہ کے لیے جلدی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ اس پورے کارخانۂ کائنات کے اندر جاری ہے۔ اس نے ہر چیز کو ایک ٹھہرائی ہوئی مدت اور ایک اندازہ کی ہوئی مہلت بخشی ہے تاکہ اس مدت کے اندر وہ اپنے مقررہ عروج و کمال کو پہنچ سکے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں ودیعت کی ہیں وہ تمام ظہور میں آسکیں۔ اسی وجہ سے وہ ظالموں پر عذاب کرنے میں عجلت نہیں فرماتا بلکہ ان کی مقررہ مدت تک ان کو مہلت بخشتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ

اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے کیے پر (فوراً) مواخذہ کرتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ لوگوں کو ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے پس جب آجائے گی ان کی اجل

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا

تو بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔

یعنی جب مقررہ مدت آجائے گی تو اللہ تعالیٰ قانون حق کے مطابق ان کا فیصلہ فرما دے گا۔ یہی وہ صبر ہے جس کا ذکر جب تدبیر و انتظام کائنات کے سلسلہ میں آتا ہے تو اس کو حلم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر مقامات پر صبر کا حکم فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

سَاَلَ سَاۗىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ (المعارج)

مانگا مانگنے والے نے واقع ہونے والا عذاب۔ کافروں کے لیے اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے۔ آئے گا درجوں والے اللہ کی جانب سے، چڑھتے ہیں اس کی جانب فرشتے اور روح ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔ پس صبر کرو، خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ اس کو دور خیال کرتے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھتے ہیں۔

اگر تم قوموں کی تاریخ پر غور کرو گے، دو باتیں نہایت صاف نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ خدا کا قانونِ عدل ہر گوشہ میں جاری و نافذ ہے۔ اور ہر معاملہ کی آخری کروٹ حق ہی کی طرف ہوتی ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَي الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون بندوں کے معاملہ میں نہایت حلیم ہے وہ ان کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے، تاکہ جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں پوری طرح آزمالے کہ وہ کون سی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی راہ جنھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور تباہ ہوئے یا ان لوگوں کی راہ جنھوں نے شکر کیا اور اطاعت کی راہ پر چل کر منزل مقصود کو پہنچے۔ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَاۗءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (یونس: ۱۳-۱۴)

اور ہم نے بہت سی قوموں کو تم سے پہلے ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا اور آچکے ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر اور نہیں تھے وہ ایمان لانے والے۔ اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے بنایا تم کو ان کے بعد جانشین ان کا زمین میں تاکہ دیکھیں تم کیا عمل کرتے ہو۔

اور یہ حقیقت بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حلم اور صبر دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر، حق کی بنیاد ہے پس اگر اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی فرمائے تو وہ حکمت باطل ہو جائے گی جس کو وہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے اور وہ حق ظہور میں نہ آسکے گا جو اس تمام کائنات کا مقصود ہے، چنانچہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمین اور آسمان کی فطرت کے اندر جو مصلحتیں اور حکمتیں ہیں ان کو ظاہر فرماتا ہے) اس مسئلہ پر ایک حد تک چھٹی اور بارھویں فصل میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

یوں ظاہر میں دیکھو تو حق اور حلم دونوں کے مزاج میں کس قدر نمایاں فرق ہے۔ ایک سراپا سخت گیری اور احتساب کا مظاہرہ ہے۔ دوسرا یکسر عفو و درگزر کا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ یہ دونوں اس طرح ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں گویا دونوں

بالکل توام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہم کو ان دونوں کو اختیار کرنے کا حکم ساتھ ساتھ دیتا ہے تاکہ ایک ہی وقت میں ہمارے لیے ہمارے باطنی و ظاہری اخلاق کی اصلاح کے دروازے بھی کھول دیے اور زمین کی وراثت اور آسمان کی تمام نعمتیں اور برکتیں بھی بخش دے اور ہم اس راہ پر گامزن ہو جائیں جو بندگی رب اور خلافت الٰہیہ کی تکمیل کی راہ ہے اور جو ہمارے اس پروردگار نے کھولی ہے جو عدل اور عفو کو پسند کرتا ہے اور عدل و عفو ہی کے ساتھ اس کائنات کا انتظام فرماتا ہے۔ اس بحث کی پوری تفصیل ہماری کتاب ملکوت اللہ[1] میں ملے گی۔

۱۶۔ سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے

سورہ کے موقع اور نظام کی توضیح کے لیے کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ سابق سورہ (سورۂ تکاثر) جیسا کہ جان چکے ہو، ان ارباب نعمت کے خسران کے بیان میں ہے جو زخارف دنیا کی طلب میں منہمک ہیں۔ اور بعد والی سورہ (سورۂ ہمزہ) میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے۔ پس یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے تاکہ ان کی آرزوؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔ اسی ضمن میں مومنین کے خصائل بھی بتا دیے اور کامیابی کے راستہ کی طرف بھی اشارہ فرما دیا اور یہ وہی مقابلہ والا اصول ہے جو قرآن مجید میں بہت عام ہے۔ مثلاً اچھوں کے ذکر کے ساتھ بروں کا ذکر آتا ہے اور جنت کے بیان کے ساتھ دوزخ کا بھی بیان ہوتا ہے۔

اس سورہ کا تعلق ماقبل سورہ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسا تعلق مندرجہ ذیل آیتوں کے مختلف اجزا کے اندر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔

اے ایمان والو، نہ تم کو غفلت میں ڈالیں تمھارے مال و اولاد اللہ کی یاد سے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس روزی میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت اس کے سر پر آجائے۔ پس وہ کہے اے میرے رب کیوں نہ دی تو نے مجھ کو کچھ مہلت کہ میں صدقہ کرتا اور بنتا نیکوکاروں میں سے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کرو۔ جو ربط ان دونوں آیتوں کے مضمون میں ہے بعینہٖ وہی ربط سورہ تکاثر اور سورۂ والعصر کے مضامین کے اندر ہے۔

---

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں اسلام کے نظام سیاسی سے بحث کرنی چاہی تھی لیکن چند فصلوں سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ ممکن ہے مولانا کے نا تمام مسودوں کے ساتھ اس کی اشاعت کی نوبت آئے۔ (مترجم)